سرمایہ دارانہ علمیت: ایک تعارف

محمد زاہد صدیق مغل

الحمد لله وكفى والصلاة والسلام على من لا نبى بعده الى كذاب والسلام على اله واصحابه اجمعين ومن اتبعه الى يوم الدين. اما بعد: فقد قا ل الله تعالى فى كلامه المجيد: ان يتبعون الا الظن. وان الظن لا يغنى من الحق شيئا. صدق الله العظيم

ضروری وضاحت: یہ مضمون اولاً ایک خطبہ تھا جو راقم نے مغربی تہذیب پر دیا تھا۔ اس وجہ سے اسکے انداز بیاں میں تحریر سے زیادہ تقریر کا عنصر دکھائی دے گا۔

کسی تہذیب میں تصور علمیت [Epistomology] کی اہمیت:

کسی تہذیب کا تصور علم اسکے اہداف و مقاصد کے اظہار کا سب سے بلند ترین درجہ ہوتا ہے۔ در حقیقت تصور علم ہی وہ اساس ہے جہاں کسی تہذیب کے مقاصد علمی و فکری سطح پر متشکل ہوتے ہیں۔ ہر تصور علم ایک تہذیب کے حیات انسانی کی حقیقت کی بابت مابعد الطبعیاتی ایمانیات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ یعنی یہ سوال کہ علم کیا ہے کا جواب مقصد علم کے بغیر دینا ناممکن ہے اور یہ مقصد لازماً ایک مابعد الطبعیاتی ایمان پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی بات ہے جس پر غور نہ کرنے کی وجہ سے کئی اہل علم وفکر نے مغربی علوم کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنے نیز انکی اسلام کاری کرنے کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس مضمون میں ہماری کوشش ہوگی کہ ہم علم کی بحیثیت مجموعی اور سرمایہ دارانہ نظریہ علم کی حقیقت واضح کریں۔

ترتیب مضمون: تین اہم سوالات: حقیقت علم کیا ہے؟

حقیقت علم کی تفہیم کے ضمن میں تین سوالات کے جوابات اصل اہمیت کے حامل ہیں:

[ا] علم کیا ہے، یعنی اسکی نوعیت و ماہیت کیا ہے؟

[۲] علم کہاں سے آئے گا، یعنی منبع علم [source of knowledge] کیا ہے؟

[۳] اس منبع علم سے حاصل ہونے والے علم کی صحت وعدم صحت [validity] کا معیار کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ علمیت کے ضمن میں ان تینوں سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے ایک طویل مضمون درکار رہوگا لہذا خوف طوالت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس مضمون میں ہم صرف پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔اس سوال کا جواب سمجھنے کیلئے تین امور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے:

[الف]علم کی نوعیت و ماہیت کا حقیقت کی بابت ایمانیات سے تعلق پر،[ب] سرمایہ دارانہ تصور علم کا اس کے تصور حقیقت سے تعلق،۔اور اسکی خصوصیات پر،[ج]چند اہم سرمایہ دارانہ علوم کی حقیقت پر:۔

اس مضمون میں ہم درج بالا ترتیب سے اپنے مدعا کو بیان کریں گے۔

ایمانیات اور تصور علم کا باہمی تعلق

علم کو عام طور پر معلومات کا ایک بامقصد مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔درحقیقت یہ 'عالم' [knower] اور 'معلوم' [known] کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے اور ان دونوں کے درمیان اس تعلق کی مقصدیت ہی 'مجموعہ معلومات' کے مافیہ [content] کی ماہیت [nature] اور درجہ بندی [hirarchy] کا تعین کرتی ہے۔یعنی کس مجموعہ معلومات پر لفظ علم کا اطلاق کیا جائے گا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ علم حاصل کرنے والے شخص کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ ہر مقصدیت سے نکلنے والا تصور علم اور معلومات کی درجہ بندی یکساں نہیں ہوتی۔اس کی مزید وضاحت کرنے سے پہلے ہم یہ بیان کرتے چلیں کہ معلومات کے ہر مجموعے پر لفظ علم کا اطلاق نہیں کیا جاتا بلکہ صرف ایک بامقصد معلومات کے مجموعے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے،مثلاً کسی پاگل شخص کو بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اسکی ان معلومات کو کسی بھی تصور علم میں 'علم' نہیں مانا جاتا۔

مقصد کا تعین ہر شخص کی ترجیحات اور فیصلے بدل دیتا ہے

مابعد الطبعیات یا مقصد پہلے ہوتا ہے علم بعد میں آتا ہے

اس بنیادی وضاحت کے بعد اب ہم ایک آسان مثال بیان کرتے ہیں۔فرض کریں آپ سائنس، انجینئرنگ اور سوشل سائنسز کے مختلف مضامین کی ایک فہرست مرتب کر کے انکی درجہ بندی کرنا چاہتے ہیں۔اگر آپ یہ فہرست کسی سائنس کے طالب علم کے سامنے پیش کریں گے تو وہ ان مضامین کی جو درجہ بندی کرے گا انکی ترتیب کچھ یوں ہوگی:

[ا] سائنس کے مضامین،[۲]انجینئرنگ کے مضامین،[۳] سوشل سائنسز کے مضامین

اس کے برعکس اگر آپ یہی فہرست کسی انجینئرنگ کے طالب علم کے سامنے پیش کریں تو وہ انہیں درج ذیل ترتیب سے مرتب کرے گا:

[ا]انجینئرنگ کے مضامین،[۲] سائنس کے مضامین،[۳]سوشل سائنسز کے مضامین

جبکہ ایک سوشل سائنسز یا بزنس ایڈمنسٹریشن کے طالب علم کی مرتب کردہ فہرست درج ذیل ہوگی:

[۱] سوشل سائنسز کے مضامین، [۲] سائنس کے مضامین، [۳] انجینئرنگ کے مضامین

مقصد زندگی علم کی نوعیت اور اہمیت کا تعین کرتا ہے:

ان طالب علموں کی مرتب کردہ فہرست میں علوم کی درجہ بندی کا یہ فرق اس مقصد اور تعلق [relevance] کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس کی خاطر یہ طلباء علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگر آپ کسی انجینئرنگ کے طالب علم سے تاریخ کی اہمیت پر بات کریں تو شاید اسکے نزدیک تاریخ ایک غیر اہم علم کہلائے، لیکن اگر کسی فلسفی کی نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ سے زیادہ اہم علم کوئی اور نہ ہوگا۔ اس مثال میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ معلومات کی علمی حیثیت اور اسکی درجہ بندی طے کرنے میں علم حاصل کرنے والے شخص کا مقصد [purpose] فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کیلئے ایک اور مثال پر غور کریں۔ آپ اور ہم بچپن سے یہ بات سنتے چلے آئے ہیں کہ 'اصل علم تو قرآن و حدیث ہی ہیں'۔ کیونکہ اصل زندگی تو موت کے بعد ہے جو بہت طویل ہے یہ زندگی تو بہت مختصر ہے جانے کب بلا آ جائے کوئی تصور علم اس تہذیب کی ایمانیات اور مابعد الطبعیات کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ آج کے جدیدیت پسند مفکرین کو یہ بات مبالغہ انگیزی دکھائی دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آیا واقعی یہ مبالغہ انگیزی ہے یا حقیقت واقعہ ہے؟ اور اگر حقیقت ہے تو کن معنوں میں یہ بات درست ہے؟

اسلام: زندگی کا مقصد آخرت میں کامیابی ہے

افضل ترین علم ذرائع علم قرآن وسنت ہیں

اس سوال کے جواب کیلئے اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کے مقصد پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ بات نہایت واضح طریقے سے بیان کی ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد دنیاوی زندگی کو پر لطف بنانے کیلئے کائنات کو مسخر کرنے کی سعی کرنا نہیں بلکہ اپنے رب کی عبادت کرنا اور اسکی خوشنودی حاصل کرنا ہے، نیز یہ کہ انسان کو یہ زندگی اس کے کسی حق کے طور پر نہیں دی گئی کہ جسے وہ جیسے چاہے ترتیب دے، بلکہ یہ زندگی اسے آزمائش کیلئے دی گئی ہے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ زندگی کا مقصد آزمائش اور حصول رضائے الٰہی ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آزمائش جس شے میں ہو رہی ہے اسکا علم کہاں سے حاصل ہوگا دوسرے لفظوں میں رضائے الٰہی حاصل کرنے کے طریقے کا علم کہاں سے ہوگا؟ کیا ہر شخص آزاد ہے کہ اپنی طرف سے زندگی کا جو بھی مقصد چاہے بنا لے یا اسکے رب نے اسکی ہدایت کا کوئی انتظام کیا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت انسانی کے لئے انبیاء و رسل کا سلسلہ جاری فرمایا اور اس ہدایت کے حصول کا آخری اور واحد معتبر ذریعہ قرآن و حدیث نبوی ﷺ کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ یہی وہ واحد ذریعہ علم ہے جس سے رضائے الٰہی کے حصول کا طریقہ جانا جا سکتا

ہے اور اس ذریعہ علم کو چھوڑ کر اس دنیا میں اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے انسان یہ جان سکے کہ میرا رب مجھے کس شے میں آزمانا چاہتا ہے نیز وہ میرے کن اعمال سے خوش ہوگا اور کون سے اعمال اسکی ناراضگی کا باعث ہونگے۔ پس ثابت ہوا کہ انسانی زندگی کے مقصد 'عبادت رب' کے معیار پر پورا اترنے والا علم وہی ہے جسے مولوی صاحب 'قرآن وحدیث' کہتے ہیں لہذا یہ بات سو فیصد درست ہے کہ 'اصل علم تو قرآن وحدیث ہی ہیں'۔

علوم عقلیہ کی درجہ بندی قرآن وسنت کے تناظر میں ہوگی

جو علوم عقلی اصل علوم کے معاون ہوں وہ اہم ہوں گے

نیز دیگر عقلی علوم کی درجہ بندی ان علوم کے اس مقصد حیات کے حصول میں معاونت وعدم معاونت کے اصول پر طے کی جائے گی۔ جو علم اس مقصد حیات کے حصول میں جتنا زیادہ ممد و مددگار ہوگا اسلامی نظریہ علم میں اتنا ہی اہم کہلائے گا، اور جس علم کا تعلق اس مقصد کے ساتھ جتنا کمزور ہوگا وہ علوم کی درجہ بندی میں اتنا ہی نیچے دکھائی دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں قرآن وحدیث کے بعد صرف ونحو، فقہ واصول، کلام ومنطق وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ہر تصور علم [یعنی مجموعہ معلومات کی نوعیت] اور اس کی درجہ بندی چند مابعد الطبعیاتی ایمانیات کی مرہون منت ہوتی ہے نیز مقصد حیات کی بابت عقائد بدل جانے سے تصور علم بھی بدل جاتا ہے۔ چنانچہ کسی تہذیب سے نکلنے والے تصور علم اور معلومات کی درجہ بندی کو اس تہذیب کی ایمانیات سے ماوراء ہو کر سمجھنا ناممکن ہے اور جو شخص بھی ایسی کوشش کرے گا لازماً غلط نتائج تک ہی پہنچے گا۔ ایمانیات اور تصور علم کے تعلق کی اس اصولی بحث کے بعد اب ہم سرمایہ دارانہ تصور علم کی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ علم کی نوعیت اور اس کے تصور حقیقت سے اس کا تعلق

آج کی دنیا بالخصوص مغربی دنیا میں جب بھی لفظ علم بولا جاتا ہے تو اس سے مراد عام طور پر 'سائنس وٹیکنالوجی' ہی سمجھا جاتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب موجودہ سائنس وٹیکنالوجی نامی کوئی بھی شے علم کے مسمہ کے طور موجود نہ تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کا موجودہ علم تمام انسانی تہذیبوں میں تحلیل ہوتا ہوا اپنا تاریخی سفر طے کر کے اس منطقی منزل تک پہنچا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک علم ایک مسلسل تاریخی عمل [Historical progression] کا نام ہے جو کسی قسم کی ایمانیات کا مرہون منت نہیں۔ ہمارے متجددین حضرات اس فکر کو اس وجہ سے اپناتے ہیں تاکہ موجودہ سائنس کو اسلامی تاریخ کا تسلسل ثابت کیا جا سکے۔ ہوسکتا ہے اس تجزیہ میں ان کے لئے خوشی کا بہت سا سامان ہو، لیکن حقیقت علم کا یہ تجزیہ کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتا۔ سرمایہ دارانہ علم [یعنی سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ] کسی مسلسل تاریخی عمل کے نتیجے میں نہیں بلکہ انسانی زندگی و کائنات کے بارے میں تصور حقیقت کی ایک ایسی تبدیلی سے پیدا ہوئے جو تحریک تنویر [enlightenment] کے نتیجے میں عام ہوئی۔

۱.۲: سرمایہ دارانہ تصور حقیقت کی ایمانیات یا مابعد الطبعیات

اس تصور حقیقت نے جن بنیادی ایمانیات اور اقدار کو اپنانے کی طرف دعوت دی وہ الختصر یہ تھے [ان اقدار کی وضاحت ہم نے اپنے جمہوریت کے مضمون میں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے، دیکھئے: ساحل، نومبر ۲۰۰۶]:

[Freedom] آزادی جس کا معنی یہ ہے کہ خیر و شر طے کرنے کا حق انسان کو حاصل ہے، یعنی خیر اور شر کا تعین خواہشات انسانی سے ہوتا ہے۔ مغربی انسان خود کو قائم بالذات اور آزاد تصور کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں آزادی کا مطلب ہے 'عبدیت' کا رد، یعنی انسان عبد نہیں بلکہ خود اپنا خدا ہے، کیونکہ انسان کو خیر و شر طے کرنے کا حق دینے کا مطلب اس بات کا انکار ہے کہ وہ عبد ہے

[Equality] مساوات جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات کی ترتیب مساوی اہمیت کی حامل ہے اور ان میں اصولاً کسی قسم کی درجہ بندی کرنا ناممکن ہے، یعنی تمام تصورات خیر و شر اور زندگی گزارنے کے تمام طریقے برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مساوات کا معنی ہے 'نظام ہدایت' کا رد، یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر بتانے کیلئے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیاء کرام کے ذریعے قائم نہیں کیا، نیز انبیاء کرام کی تعلیمات خیر و شر طے کرنے کا کوئی حتمی معیار نہیں ہیں بلکہ خیر و شر تو انسان خود طے کرے گا اور ہر شخص کا تصور خیر مساوی حیثیت رکھتا ہے

[Progress] ترقی جس کا حاصل یہ ہے کہ زندگی میں انسان کا مقصد اپنے ارادے، عزائم اور خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل تسکین [maximum satisfaction] کے موثر ترین طریقے اختیار کرنا اور ارادہ انسانی کی یہی منتہا تکمیل ترقی کا جوہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترقی کا مطلب ہے 'آخرت' کا اور دنیا کے 'دارالامتحان' ہونے کا رد

تصور حیات کی اس تبدیلی کے بدولت ایک ایسے 'جدید انسان' کی تخلیق ہوئی جس کی دلچسپی کا محور مذہب کے بجائے دنیاوی معاملات سے بے پناہ رغبت تھی، اور جس میں ایک ایسا نیا ولولہ اور جوش تھا جو اسے غیر مشروط آزادی کی طرف مائل کرتا تھا۔ اس تبدیلی کی تصویر کشی ڈاکٹر ظفر حسن نے اپنی کتاب 'سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت' میں خوبصورت الفاظ میں کی ہے۔

''یہ ایک ایسا انسان تھا جو اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر دینا چاہتا تھا... اٹھارویں صدی کے اوائل میں کہا جانے لگا کہ بزرگوں نے نئی نسل کو ایک ایسا معاشرتی نظام دیا ہے جو نرا دکھاوا اور دھوکا ہے اور جو ہر برائی کا ذمہ دار ہے... اٹھارویں صدی کی نسلیں اس نظریے کو کہ انسان کو کوئی الہامی پیغامات وصول ہوتے ہیں بالکل رد کر کے وحی کا انکار کر دینا چاہتی تھیں۔ القصہ مختصر وہ انسانی زندگی کو کسی حال میں بھی مذہبی طرز فکر

سے نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ایک نئی چیز کو جنم دیں گی، عقل کی روشنی سے وہ ظلماتی دور کو نیا نور بخشیں گی اور قدرت کے منصوبے کو دریافت کرلیں گی اور اسطرح انسان کا ایک پیدائشی حق یعنی انسانی خوشی اور خوشحالی انسان کے لئے بحال کردیں گی‘‘

۲.۲: سرمایہ دارانہ یا سائنسی علم کا مفہوم: کائنات پر ارادہ انسانی کی بالادستی

جدید علم کا مطلب وہ صلاحیت جس سے انسان ہر خواہش کی تکمیل پر قادر ہو

حیات انسانی کی مقصدیت کے بارے میں یہ گمراہ کن تصورات سترہویں اور اٹھارویں صدی کی پیداوار ہیں جنکے نتیجے میں علم کا ایک نیا تصور ابھرا۔ اگر اس دنیا میں انسان کا مقصد ارادے اور خواہشات کی تکمیل ہے تو پھر اس کائنات میں لامحدود خواہشات انسانی کی تکمیل کیلئے ضروری ہے کہ یہاں کی تمام اشیاء وموجودات اسکے ارادے کے تابع ہوجائیں، کیونکہ جب تک وہ انسانی ارادے کے تابع نہیں ہوجاتیں، تکمیل خواہشات کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً انسان کی ایک خواہش یہ بھی ہوسکتی تھی کہ وہ ہوا میں اڑے، لیکن اس کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ وہ زمین کی اپنی طرف گرانے کی قوت پر قابو پائے۔ اشیاء وموجودات کو اپنے ارادے کے تابع کرنے کیلئے ضروری تھا کہ انسان ایسی معلومات حاصل کرنے کے درپے ہو جو اسے تسخیر کائنات کی راہ سجھائے۔ لہذا اس تصور حقیقت [کہ زندگی کا مقصد ارادہ انسانی کی تکمیل ہے] سے جو تصور علم نکلا اسکے مطابق علم سے مراد ایسی بات جاننا ہے جس کے ذریعے انسان اس چیز پر قادر ہوجائے کہ اسکے ارادے خواہشات آرزوں، تمناؤں، چاہتوں نفس کے مطالبوں کی تکمیل کیسے ہوسکتی ہے اور وہ علم جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ کائنات پر اسکے ارادے کا تسلط کیسے ممکن ہے اسے 'سائنس' کہتے ہیں۔ لہذا ترقی کا اصل معنی ہے علم کو سائنس کے ہم معنی قرار دینا، یعنی ترقی سے مراد ان معلومات میں اضافہ ہے جو انسانی ارادے کی تکمیل کو ممکن بناتی ہوں۔ گویا مغربی تہذیب میں 'ارادے وخواہشات کی تکمیل' ہی معلومات کے مجموعے اور عالم [knower] کے درمیان تعلق کی بنیاد ٹھہرا [سائنس کی حقیقت وماہیت کیلئے ہمارا تفصیلی مضمون ساحل نومبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں دیکھئے]۔

علم جدید کا مطلب رب کی رضا جاننا نہیں نفس کی رضا کی تکمیل ہے

تصور علم کی یہ تبدیلی انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تبدیلی ہے

یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں علم وہ چیز جاننا نہیں ہے کہ جس سے انسان اپنے رب کی رضا جان لے، یعنی علم یہ نہیں کہ مجھے وضو یا غسل وغیرہ کرنے کا طریقہ اور مسائل معلوم ہوجائیں بلکہ علم تو یہ ہے کہ میں یہ جان لوں کہ پنکھا کیسے چلتا ہے، بجلی کیسے دوڑتی ہے، جہاز کیسے اڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گویا اب علم رضائے الٰہی کے حصول کا طریقہ جان لینا نہیں، بلکہ تسخیر کائنات یا بالفاظ دیگر انسانی ارادے کے کائناتی قوتوں پر تسلط قائم کرنے کا طریقہ جان لینے کے ہم معنی بن گیا۔ تصور علم کی یہ تبدیلی انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تبدیلی تھی جس نے

انسان کی کامیابی کو کسی خدا کی اطاعت [obedience] کے ساتھ نہیں بلکہ لامتناہی خواہشات انسانی کی تکمیل و ارادہ انسانی کے تسلط [dominance] کے ساتھ مشروط کردیا۔ سائنسی علم کا یہ مقصد اور اسکے پھیلاؤ کیلئے درکار ضروری اسباب کا نقشہ سائنس کے موجدین اور فلاسفہ نے بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلاً گلیلیو کا مشہور مقولہ ہے: Bible shows us the way to heavens, but it does not show the way heavens go یعنی 'بائبل ہمیں جنت میں جانے کا راستہ تو بتاتی ہے، مگر یہ نہیں بتاتی کہ یہ کائنات کیسے چلتی ہے۔ مشہور تاریخ دان H.G. Wells راجر بیکن جسے جدید سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے کے خیالات کو کچھ اس طرح خراج تحسین پیش کرتا ہے:

''بیکن کی کتابیں جہالت کے خلاف بغاوت تھیں۔ اس نے اپنے دور کے لوگوں کو بتایا کہ وہ جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور یہ ایک ایسی بات تھی جسے اس دور میں کہنے کے لئے بہت ہمت درکار تھی۔ قرون وسطی کے لوگ اپنے دور کی ذہانت اور ایمانیات کے سچ ہونے کے بارے میں جذباتی حد تک قائل تھے اور انکے خلاف ہر گز کوئی تنقید برداشت نہ کرتے۔ راجر بیکن کی کتابیں ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ 'غیر عقلی ایمانیات اور مسلمہ مقتدرہ [Authority] کی پیروی کرنا چھوڑ دو'۔ دنیا پر غور کرو، [حصول علم کے لئے] تجربہ تجربہ اور تجربہ [پر زور] ہی اسکا مقصد تھا۔ اسنے جہالت کے چار اسباب بیان کئے: [۱] مسلمہ مقتدرہ کا احترام، [۲] اسلاف کے طور طریقوں پر عمل، [۳] ریت ورواج کی پیروی، [۴] اور ہمارے فخر یہ مگر نہ سمجھ آنے والے دکھاوے۔ اگر ہم ان چیزوں سے جان چھڑالیں تو پھر سائنسی ایجادات اور مکینیکل قوت سے بھر پور ایک نئی دنیا انسانیت کو دکھائی دے گی۔۔۔[میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ] بحری سفروں کے لئے بغیر ملاحوں کی ایسی مشینیں بنانا ممکن ہے جسے صرف ایک آدمی اس کشتی کی رفتار سے کئی گنا تیز چلا سکتا ہوگا جسے کئی ملاح مل کر چلاتے ہیں۔ اسی طرح بغیر ڈھور ڈنگر سے چلنے والی ایسی سواریاں بنانا بھی ممکن ہے جو پرانے دور کی تیز ترین سواریوں سے تیز چلتی ہونگی۔ اور ہوا میں اڑنے والی ایسی مشینیں بنانا بھی ممکن ہے جس میں انسان بیٹھ سکتا ہو اور وہ مشین بالکل پرندوں کی طرح پر ہلا کر چلتی ہو'

عہد حاضر بیکن کا فرضی جزیرہ ہے جہاں سب کچھ ممکن ہے

بیکن نے یہ تمام تفصیلات اپنی کتاب The New Atlantis میں بیان کی ہیں جس میں اس نے ایک ایسے فرضی جزیرے کی تصویر کشی کی ہے جہاں سائنسی تحقیقات کرنے والا ایک بہت بڑا ادارہ قائم کردیا گیا ہے۔ جہاں کا حاکم آنے جانے والے لوگوں کو اس جگہ کی سیر کراتا ہے اور ان سے کہتا ہے ''ہمارے اس ادارے کا مقصد علل و معلول [cause and effect] و حرکت کائنات کے قوانین اور انسانی ارادے کی حدود کی توسیع کرنے کے طریقے کا علم حاصل کرنا ہے تا کہ ہر کام کرنا ممکن ہو سکے''۔ [A Short History of the

World, by H.G. Wells, p. 200-01، بحوالہ مریم جمیلہ صاحبہ کی معرکۃ الاراء کتاب Modern Technology and the Dehumanization of Man]۔ اس تصورِ علم میں فطرت ان معنوں میں انسان کی حریف ٹھہری کہ یہ انسانی ارادے کی تکمیل پر حد بندی کرتی ہے اور اسے تسخیر کرکے انسانی ارادے و خواہشات کی تکمیل کیلئے استعمال کرنا ضروری ٹھہرا۔ آج بھی موجودہ سائنسی علمیت کا یہ جنون ہے کہ انسانی عقل کو استعمال کرکے فطرت کے تمام رازوں سے پردہ اٹھانا نیز انسانی ارادے کو خود اسکے اپنے سواء ہر بالاتر قوت سے آزاد کرنا عین ممکن ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جینیٹکس [Genetics] کی فیلڈ میں تحقیقات کرکے انسانی خون میں ایسی تبدیلیاں لانا ممکن ہے جس کے بعد اسکے اندر پائے جانے والے غضب اور حسد جیسے جذبات کو ختم کرکے دنیا کو جنگوں سے نجات دلائی جاسکے گی، اسی طرح سائنس دانوں کو امید ہے کہ موت پر قابو پانا ممکن ہے، اور نجانے کیا کچھ اور۔ سائنس کے اس اصل جنون کا اظہار دور جدید کی انگریزی زبان میں بننے والی سائنس فکشن فلموں میں سب سے واضح انداز سے نظر آتا ہے جن کے جملوں، الفاظ اور مرکزی خیالات میں نت نئے انداز کے ساتھ انسان کی خود اپنا خدا بننے کی خواہش جلوہ گر ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں سائنس کیوں عروج نہ پاسکی؟

تصورِ علم کی اس یکسر تبدیلی کو کلیتاً نظر انداز کرنے کے نتیجے میں اکثر مسلم جدیدیت پسند مفکرین دو غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے: ایک طرف تو وہ قرآن وسنت کے علم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے بلکہ ان کے نزدیک اصل علم سائنس وٹیکنالوجی ہی کا علم ہے، اور دوسری طرف وہ سائنس کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنے اور مسلمانوں کو سائنس کا موجد ثابت کرنے کی ناکام کوششوں میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہتے ہیں۔ آخر اسکی کیا وجہ ہے کہ تقریباً پچھلی ایک صدی کی بھرپور تحقیقات کے بعد بھی جدیدیت پسند حضرات اسلام کی ابتدائی ایک ہزار سالہ تاریخ میں پچاس سے زیادہ مسلم سائنس دانوں کے نام تلاش نہ کرسکے جبکہ اس کے مقابلے میں جدیدیت کی صرف تین سو سالہ تاریخ سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سائنس دانوں کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ اسی بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ سے اگر ان لوگوں کے ناموں کی فہرست تیار کی جائے جنہوں نے قرآن وعلوم قرآن، حدیث وعلوم حدیث، فقہ واصول فقہ وغیرہ پر علمی تحقیقات پیش کیں تو بلا مبالغہ لاکھوں افراد کے ناموں کی فہرست تیار ہو جائے گی، جبکہ اگر اسی معیار پر جدیدیت کی تاریخ میں عیسائی علمیت پر کام کرنے والے افراد کے نام تلاش کئے جائیں تو انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اصل اسلامی علمیت کیا ہے نیز سائنسی تحقیقات وغیرہ اصل علمیت [main stream discourse] سے دور کی چیزیں تھیں۔ اگرچہ چند افراد اپنے شوق کی تسکین کی خاطر ان تحقیقات میں دلچسپی بھی لیتے تھے تو اسکے ذریعے انہیں معاشرے میں کوئی اونچا مقام و مرتبہ حاصل نہ ہوتا بلکہ 'امام' اور 'علامہ' جیسے باوقار الفاظ ہمیشہ اسلامی علوم کے ماہرین ہی کا خاصہ ہوتے تھے

۔اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ افراد جنہیں مسلمان سائنس دانوں کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے ان میں سے اکثر و بیشتر کی مسلمانیت ہی مشکوک رہی ہے۔ مثلاً کندی اور فارابی کا نام بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ انکے افکار کس قدر گمراہ کن تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام سائنسی قسم کے مسلمان معتزلی یلغار کے بعد کی پیداوار ہیں، اور ان میں سے اکثر و بیشتر کا تو تعلق ہی معتزلی گروہ سے تھا۔ ایسے افراد کو اسلامی تاریخ کا ہیرو ثابت کرنے کا مطلب اپنی اصل علمیت کو غیر معتبر ثابت کرنے کے سواء اور کیا ہوسکتا ہے؟ دراصل جدیدیت پسند حضرات کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہر علمیت کا میابی کے ایک مخصوص مابعد الطبعیاتی تصور پر قائم ہوتی ہے اور ہر علمیت کا بنیادی مقصد افراد کو چند مابعد الطبعیاتی تصورات کو بطور مقصد حیات قبول کرنے کی روش اختیار کرنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ سائنس کو اسلامی علمیت میں تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ اسلامی علمیت کا مقصد بھی انسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے تسخیر کائنات کرنا ہے۔ پس اگر دو مختلف دائروں سے نکلنے والی علمیات کے مقاصد مختلف ہوں گے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ پروان چڑھ سکیں۔

سرمایہ دارانہ علم کے فروغ کیلئے مذہبی علمیت کا انہدام ضروری ہے:

ایسا نہیں ہے کہ صرف مذہبی معاشروں میں ہی سائنسی علمیت نہیں پھیل سکتی، بلکہ سائنسی معاشروں میں بھی مذہبی علمیت برگ و بار نہیں لاسکتی [ذرا بیکن کے اوپر دیئے گئے خیالات ایک بار پھر دہرالیں]۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ علمیت کے اس جاہلانہ تصور کو عوام الناس میں رائج کرنے کیلئے ضروری تھا کہ اس وقت کے معاشروں میں پائے جانے والے مقبول عام تصور علم کو غیر معتبر اور لایعنی ثابت کیا جائے۔ قرون وسطی میں موجود علمیت کوئی اور نہیں بلکہ عیسائی علمیت تھی جسے ہر طرح کے جھوٹے پروپیگنڈوں اور نام نہاد عقل پرستی کے دعووں کی آڑ میں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ اس ضمن میں اہم بات یہ کہ عوام الناس کا عیسائی علمیت پر ایمان کمزور کرنے کیلئے سب سے ضروری یہ تھا کہ اس علمیت کے حامل فرد یعنی پوپ کی شخصیت کو متنازع اور مشکوک بنایا جائے۔ تاکہ عوام الناس کا رابطہ کیتھولک چرچ کے ساتھ ٹوٹ جائے جہاں سے انہیں دنیا کے دارالامتحان ہونے اور آخرت کی تیاری کا سبق ملتا تھا تاکہ جدیدیت کے حامی ان کے قلوب میں دنیا داری کے بیج بوسکیں۔ جدیدیت دنیا کے جس ملک میں بھی گئی اس نے مذہبی پیشواؤں کے عوامی اثر و رسوخ کو کم کرنے کے تمام حربے استعمال کئے۔ سرمایہ داری اس وقت تک معاشروں کو مسخر نہیں کرسکتی جب تک افراد زندگی کے ہر معاملے کو معاد [Day of Jugdment] کے بجائے معاش [Economic] کے نقطہ نگاہ سے نہ دیکھنے لگیں، اور نقطہ نظر کی یہ تبدیلی مذہبی پیشواؤں اور اداروں سے لاتعلقی پیدا کئے بغیر ناممکن ہے۔

روایتی اداروں کی اہمیت:

یہ نہایت اہم بات ہے جس کی کچھ مزید تفصیل ہم یہاں بیان کرنا چاہیں گے۔ خاندان، مسجد، مدرسہ

اور خانقاہ اسلامی معاشروں کے ایسے فطری ادارے ہیں جو جدیدیت کے پھیلاؤ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ لیکن جدیدیت کے پھیلاؤ نے مسلمانوں کا خانقاہ سے تعلق تقریباً ختم کر دیا ہے جو یقیناً خطرے کی علامت ہے کیونکہ خانقاہ ہی وہ ادارہ تھا جہاں لوگ بچپن ہی سے اپنے بچوں کے تزکیہ نفس کا سامان فراہم کرنے کیلئے انہیں کسی مرد صالح کے ہاتھ بیعت کرا کے ان کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب دلاتے، اور اس سلسلے کے ختم ہو جانے کے بعد اب مسلمانوں میں تزکیہ نفس کا کوئی ادارہ موجود نہیں۔ کسی تہذیب کا زوال درحقیقت ان اداروں کی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے عیاں ہوتا ہے جو ایک تہذیب کے مقاصد کے حصول کی خاطر افراد کے تعلقات کے نتیجے میں ابھرتے ہیں۔ افراد جب کسی شے کے حصول کو اپنا مقصد بناتے ہیں تو اسکے حصول کے لئے کوئی نہ کوئی انتظامی شکل ضرور اختیار کرتے ہیں اور بہت سی انتظامی شکلوں میں سے وہی شکل زندہ رہ جاتی ہے جو زیادہ مؤثر اور قابل عمل ہوتی ہے۔ کوئی مخصوص انتظامی ہیئت ان معنوں میں تو ضروری نہیں ہوتی کہ وہ بذات خود اصلاً مطلوب نہیں تھی، مگر ان معنوں میں یقیناً ضروری ہوتی ہے کہ اس کی بقا سے افراد کے معاشرتی مقاصد قائم رہتے ہیں اور اسکا انہدام ان تمام مقاصد کے انہدام کا باعث بھی بنتا ہے جو اس کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت ایک آسان مثال سے کی جاسکتی ہے۔ ہمارے گاؤں دیہات میں ترپال، چوپال اور بیٹھک لوگوں کی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ ہوا کرتے تھے [کہیں کہیں اب بھی یہ نشستیں موجود ہیں]۔ اب دیکھئے اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والوں کے تعلقات سے جو معاشرہ وجود میں آئے وہاں پڑوسیوں کی خوب خبر گیری ہونی چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ خیال کیسے رکھا جائے؟ اسکا انتظام کیا ہو؟ کیا ہر شخص روزانہ رات سونے سے پہلے اپنے پڑوسی کا دروازہ بجا کر اس سے پوچھے کہ بھائی کیسے ہو۔ ظاہر ہے ایسا تو نہیں ہوسکتا، مگر پھر کیا ہو۔ اب ذرا غور کریں کہ یہ بیٹھک کیا ہے؟ ایک عام نشست کی ایسی جگہ جہاں لوگ شام کے وقت تھوڑی دیر دل لگی اور فرحت طبع کے لئے اکھٹے بیٹھتے جس کے ذریعے انہیں پورے گاؤں اور اس کے اطراف کے لوگوں کے حالات معلوم ہوتے، مثلاً گاؤں میں کون بیمار ہے، کس کے گھر شادی ہے، کس کے گھر فوتگی ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی شخص دو دن تک بیٹھک نہ آتا تو لوگ اسکے گھر خیریت معلوم کرنے جاتے۔ یوں سمجھئے کہ ایک طرف تو یہ گاؤں کے حالات حاضرہ کو افراد تک پہنچانے کا ایک مکمل طریقہ تھا تو دوسری طرف ایک ساتھ مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کا خیال کرنے کی اقدار کے فروغ کا ذریعہ تھا۔ پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے کا بھلا اس سے بہتر انتظام اور کیا ہوسکتا تھا؟ لیکن پھر ٹی وی آ گیا اور ہر شخص فرحت طبع کے لئے اب بیٹھک کے بجائے اپنے اپنے گھر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کا عادی ہونے لگا۔ نشستیں ختم ہونے لگیں، اور ان نشستوں کے ٹوٹنے سے وہ سارا ماحول بھی ہمارے معاشروں سے رخصت ہو گیا جو انکا مرہون منت تھا۔ کہا جانے لگا کہ ٹی وی سے ہمیں خبریں ملتی ہیں، مگر کس کی خبریں؟ وہ خبریں جو ہمارے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے کسی کام کی نہیں۔ ٹی وی لوگوں کو یہ تو بتاتا ہے کہ بھارت میں کس فلمی ہیرو کی شادی کس ہیروئن سے ہوئی،

امریکہ میں لوگ روزانہ کتنے کتے خریدتے ہیں، مگر انہیں یہ نہیں بتا سکتا کہ تمہارے پڑوسی کس حال میں ہیں۔ ٹی وی بیچارہ کیا کرے اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ وہی بات کہے گا جہاں سے اسے پیسے ملنے کی امید ہو کیونکہ اس کا تو سارا دھندہ ہی اشتہاری کمپنیوں کے سرمائے کا فروغ ہے۔ ہم یہاں ٹی وی کے نقصانات کی بات نہیں کر رہے بلکہ معاشرتی مقاصد کے حصول کے ضمن میں اداروں کی بقا کی اہمیت وافادیت کی بات کر رہے ہیں کیونکہ یہ ادارے ہی ہیں جو افراد کا تعلق کسی خاص مقصد سے منسلک اور قائم رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔ پس سرمایہ دارانہ علمیت کو شکست دینے کیلئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو ہم اپنی مساجد اور مدارس کے دائرہ کار کو بڑھائیں اور دوسری طرف خانقاہوں کو پھر سے زندہ کریں۔ اوران روایتی اداروں کو بھی جو اجتماعی مسائل کے حل کے لیے تاریخی طور پر وجود میں آئے۔

۲.۳: سرمایہ دارانہ علم کی خصوصیات [طریقہ حصول علم کے اعتبار سے]

سائنس یا سرمایہ دارانہ طریقہ حصول علم میں حتمی بات اور قانون معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا [اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے سائنس پر ہمارے مضامین ساحل اگست اور نومبر ۲۰۰۶ میں]۔ سائنسی علمیت حقیقت کے ارتقائی تصور پر ایمان رکھتی ہے جسے سمجھانے کیلئے ہم ارتقائی تصور علم کی چند خصوصیات بیان کرتے ہیں:

[الف] <u>غیر قطعیت [uncertainity]</u>:

ارتقائی علمیت کا پہلا اصول یہ ہے کہ حتمی سچ جاننا ناممکن ہے، البتہ سائنسی طریقہ علم استعمال کر کے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ انسانیت ایک حتمی سچ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

[ب] <u>تردیدیت [Falsification]</u>:

اس تصور علم میں وہی دعوی اور قضیہ علم کہلانے کا مستحق ہے جسے تجربے میں لا کر رد کرنا ممکن ہو۔ سائنس میں علم کو غیر علم سے ممیّز کرنے کا معیار تردیدیت ہے یعنی اگر کسی بات کو تجربے کے ذریعے غلط ثابت کرنا ناممکن ہو تو وہ علم کی تعریف پر پوری نہیں اترے گی جس علم خیال، نظریے، مفروضے کی تردید نہ ہو سکے اسے علم کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں زندگی بعد الموت وغیرہ جیسے حقائق علم نہیں سمجھے جاتے کیونکہ یہ سائنس کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ اس بات کو دوسرے انداز سے یوں سمجھئے کہ ارتقائی علم وہی ہو سکتا ہے جسے غلط ثابت کرنا ممکن ہو کیونکہ جو بات غلط ثابت نہیں کی جا سکتی اس میں ارتقاء کہاں سے آئے گا؟

<u>سرمایہ داری وسائنس کی ایمانیات سائنسی معیار پر نہیں جانچی جا سکتی</u>

<u>ایمانیات اور مابعد الطبعیات پر تو ایمان لانا ہوتا ہے</u>

کائنات پر تسلط ہی اصل مقصد انسانی ہے

البتہ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سرمایہ داری اور سائنس کی اپنی ایمانیات کبھی سائنس کے اس

معیار پر نہیں جانچی جاتیں بلکہ انہیں ماننا تو ایمانیات کا حصہ ہے اور جو انہیں نہیں مانتا وہ ہیومن کہلانے کا مستحق نہیں۔

مثلاً سائنس کا یہ مفروضہ کہ علم کا منبع انسان کی ذات ہے [یعنی علم انسان کی ذات سے نکلتا ہے] کسی بھی تجربے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا [یعنی یہ تردیدیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا] لیکن پھر بھی سائنس اسے مفروضے کے طور پر تسلیم کر کے آگے بڑھتی ہے۔ گو کہ سائنسی علمیت میں حوادثات عالم کی تشریح اور حقیقت کیلئے کسی ایسی مقصدیت کو تلاش کرنا جس کی نسبت ارادہ انسانی سے باہر مثلاً خدا کی طرف ہو سائنس کے نزدیک ایک لایعنی بات ہے لیکن سائنس یہ نہیں بتا سکتی کہ خود انسانی ذات کی حقیقت کیا ہے بلکہ اسے آزاد اور خود مختار فرض کرتی ہے۔ ایسے ہی سائنس کا یہ مفروضہ بھی محض ایمان ہے کہ یہ کائنات کسی خارجی کنٹرول کے بغیر چلنے والا ایک ایسا مکمل قائم بالذات نظام ہے جس کے اندر تبدیلیاں اس کے اندرونی نظام کے تحت آتی ہیں نیز اس کی معنویت سمجھنے کیلئے کسی خدا کی ضرورت نہیں بلکہ اس مشین کو علت و معلول کے چند اصولوں کے ماتحت سمجھنا ممکن ہے [البتہ سائنس کی دنیا میں ہونے والی تازہ ترین Quantum Mechanics کی تحقیقات نے سائنس کے اس ایمان کی جڑیں ہلا کر کے رکھ دی ہیں]۔ گویا اگر انسان علت و معلول کے قانون کے ماتحت رونما ہونے والے سلسلے کو دریافت کر لے تو نہ صرف یہ کہ وہ اشیاء کی حقیقت سمجھ سکتا ہے بلکہ اسے قابو میں لا کر ان پر اپنا تسلط قائم کر سکتا ہے۔ سائنس کے نزدیک انسان کا اپنی آزادی کی تکمیل کیلئے کائناتی تسلط قائم کرنا ہی اصل حقیقت اور مقصد انسانی ہے۔

شک نہ کہ ایمان:

سرمایہ دارانہ تصور علم کے مطابق کسی بات کو حتمی اور آخری سمجھ کر اس پر صمیم قلب سے ایمان لے آنا اور دوسروں کو اس کی دعوت و تبلیغ کرنا غیر علمی طریقہ کہلاتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر بات میں شک کرنا اور کسی چیز کو رد کرنے کی کوشش کرنا ہی اصل علمیت کہلاتی ہے۔ جو شخص مذہبی حقائق پر ایمان لائے اس پر انتہا پسند، بنیاد پرست اور دہشت گرد کے لیبل چسپاں کر دیئے جاتے ہیں

ترقی [بہتری]:

ہر نئے دور کا سچ پچھلے دور کے سچ سے بہتر گردانا جاتا ہے کیونکہ اس میں پچھلے دور کے تصور حقیقت کے اچھے پہلو کو شامل کر لیا جاتا ہے اور کمزور پہلوؤں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہذا ہر آنے والا دور پچھلے دور سے بہتر ٹھہرتا ہے۔ مغربی دنیا میں سپنسر، ہیگل اور مارکس وغیرہ نے انسانی علم کے رفتہ رفتہ ایک خاص منزل کی طرف بڑھنے کے تصور کی بناء پر تاریخ کی اپنی اپنی تعبیرات پیش کی ہیں جن سب کا حاصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی لا شعوری طور پر ایک ایسے عظیم الشان مقصد کی طرف رواں دواں ہے جہاں پہنچنا اس کا مقدر ہے، لہٰذا ہر آنے والا دور پہلے سے بہتر ہے۔ ان تمام تعبیرات کی حیثیت چند قصوں اور کہانیوں سے زیادہ اور کچھ نہیں جو ان لوگوں نے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ کر گھڑی تھیں۔

خیرالقرون عہد نبوی ہے یا جدید سائنسی عہد؟

جدیدیت پسند مسلمانوں کو مولوی کی یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ ''ہم مسلمانوں کا سب سے اچھا دور تو دور نبوی، دور صحابہؓ اور سلف صالحین کا دور تھا جو گزر چکا، لہذا اب آنے والا ہر دور پہلے سے بہتر نہیں بلکہ برا ہو گا جیسا کہ احادیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے''۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ مولوی ہمیں پیچھے کی طرف لے جانا چاہتا ہے، اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ مولوی تو یہی چاہتا ہے کہ دنیا کسی طرح پھر ویسی ہی ہو جائے جیسی آقائے دو عالم ﷺ اور اس کے اصحاب کے دور میں تھی۔ اسی جرم میں مولوی پر دقیانوسی اور تنگ نظر ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے کہ یہ ہمیشہ یہ طے کرنے کیلئے کہ ''ہمیں آگے کیا کرنا چاہئے'' مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف دیکھنے کو کہتا ہے، یہ آج کے عمل کو ماضی کے پیمانوں پر کسنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف پلٹنا سکھاتا ہے، یہ تو ترقی کا دشمن ہے اور یہ دنیا کو پھر پتھروں کے دور میں واپس لے جانا چاہتا ہے۔

ایک سے زیادہ حق کا امکان:

اس نظریہ علم میں چونکہ کسی بھی چیز کی بابت مسلمہ اور حتمی علم موجود نہیں ہوتا، لہذا ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ حق نیز دو مختلف افراد کیلئے دو مختلف حق ہو سکتے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں بیک وقت ایک ہی شے کے بارے میں دو مختلف نظریات [theories] کا ہونا معلوم کی بات ہے۔ دوسرے لفظوں میں حق وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ہر ایک کو اپنے اپنے تصور حق کو حق سمجھنے کی آزادی ہے۔

تحقیق برائے تحقیق کا نہج:

چنانچہ تحقیق برائے تحقیق کا نام ہی علمی کاوش پڑ گیا، چاہے وہ تحقیق بندروں اور کتوں وغیرہ کے حالات زندگی جمع کرنے کا کام ہی کیوں نہ ہو۔ ہر لغو سے لغو بات جس میں انسانی خواہش کوئی معنی دیکھتی ہو لائق تحقیق ٹھہرتی ہے کیونکہ ہر شے کے معنی اللہ تعالی اور اس کے نبی ﷺ کے اقوال کی روشنی میں نہیں بلکہ انسانی خواہشات اور ارادے کی تکمیل کے پیمانے پر تول کر متعین کئے جاتے ہیں۔

ارتقائی تعبیرات کی تلاش:

دور حاضر میں موجود ہر معاشرتی و انسانی ادارے و عمل کی وحی سے علی الرغم ایک ارتقائی تعبیر پیش کرنے کی روش عام ہو جاتی ہے اور اس فرضی قیاس آرائی کو ہی علمی کارنامہ سمجھا جانے لگتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بہت عمدہ مثال یاد آئی۔ ایک مرتبہ ہمارے ایک بزرگ ساتھی [اللہ تعالی انہیں جنت نصیب فرمائے] نے ایک محفل میں شادی کے موضوع پر ہونے والی ہوئی گفتگو میں تمام شرکاء مجلس سے سوال کیا 'کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ شادی کا ادارہ کیسے قائم ہوا؟' سب نے پوچھا کہ جناب آپ بتائیے۔ تو انہوں نے کہا کہ اولاً تمام انسان بھی جانوروں کی طرح جنسی تعلقات استوار کرتے تھے، یعنی جس مرد و عورت کا جس سے دل چاہا خواہش پوری کر لی۔ ایک عرصے

تک معاملہ یونہی چلتا رہا، لیکن پھر آہستہ آہستہ انسانوں میں جذبہ رقابت نے جوش مارا، اور لوگوں کو یہ بات بری محسوس ہونے لگی کہ کل تک جو عورت میرے ساتھ تھی آج کسی اور مرد کے ساتھ کیوں ہے؟ اس جذبے کے زیر اثر انسانی معاشروں میں طاقت کے قانون کا راج شروع ہونے لگا یعنی جس نے آگے بڑھ کر پہلے کسی عورت پر قبضہ جما لیا پس وہ ہمیشہ کیلئے اسکی ہوگئی۔ پھر بچوں کی پیدائش کے بعد بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال کے مسائل سامنے آنے لگے جنہیں حل کرنے کیلئے لوگوں نے کئی طرح کے قوانین بنانے شروع کر دیئے۔ مثلاً یہ کہ بچوں کی ذمہ داری اسی پر ہوگی جس نے عورت پر قبضہ جمایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یوں انسانیت لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ لوگوں نے مرد و عورت کے جنسی تعلق کی بنیاد شادی کے ادارے کے ساتھ منسلک کر دی۔ جب وہ بزرگ تمام کہانی سنا چکے تو میں نے پوچھا کہ یہ کہانی آپ نے کہاں سے سنی، تو فرمانے لگے کہ فلاں سوشل سائنس کے جرنل میں فلاں محقق نے یہ مقالہ لکھا ہے۔ میں نے کہا یہ بتائیں کہ اس پوری کہانی میں انسانی معاشروں کی کردار سازی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد انبیاء کرام کا کردار کیا رہا؟ کیا انبیاء نے لوگوں کو نہیں بتایا کہ انہیں کیسے زندہ رہنا چاہئے نیز کیا ان کی تعلیمات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا؟ اس کہانی سے تو یہ تصور ابھرتا ہے کہ گویا اول تو انبیاء نام کی کوئی ہستی انسانی تاریخ میں گزری ہی نہیں، اور اگر تھی بھی تو شاید وہ دنیا کی سیر وغیرہ کرنے کیلئے آتے تھے نیز انسانوں اور معاشروں نے اپنی زندگیاں وحی الٰہی کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنے حیوانی جذبات کے تحت گزاری تھیں۔ یہ کہانی تو ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص حضور پرنور ﷺ کا نام لئے بغیر یہ کہے کہ مسلمانوں کے معاشروں میں پایا جانے والا شادی کا تصور درحقیقت اسلام سے قبل عربوں کے معاشرے میں پائے جانے والی جنسی بے راہ روی کی ارتقائی شکل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے، کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ معاشرتی تبدیلی انسانی جذبات کے محرکات کے طور پر نہیں بلکہ خاص تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر شادی کے ادارے کا یہ سفر کوئی ارتقائی سفر تھا تو پھر مغرب میں یہ ادارہ ٹوٹ کیسے گیا؟ ارتقاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ادارہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی معاشرہ انبیاء کرام کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر زندگی گزارتا ہے تو وہاں زندگی کا اظہار صرف حیوانی سطح پر ہی ہوتا ہے جسکا نظارہ ہم مغربی دنیا کی غلیظ اور ناپاک معاشرت میں کر سکتے ہیں۔

یہ محض ایک مثال تھی، ورنہ اس طرز کی اور بھی کئی فرضی کہانیاں ہمارے ہاں مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ انسانیت پر غاروں اور پتھروں کا دور گزرا کہ جب سب لوگ غاروں میں رہتے تھے، پتے اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے بدن ڈھانپتے تھے، جنگلوں میں جنگلیوں کی طرز کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام کہانیوں کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ یہ سب کی سب انسانی معاشروں کی تشکیل میں وحی اور انبیاء کرام کے کردار کو نظر انداز کرنے کیلئے گھڑی گئی ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں وحی کو علم نہیں سمجھا جاتا۔ کیا کوئی مسلمان اس

بات کا تصور کرسکتا ہے کہ معاذ اللہ انبیاء کرام جنگلیوں کی مانند زندگیاں گزارتے رہے ہوں گے؟

شرائع کی تبدیلی اور فلسفہ ارتقاء کا انوکھا گٹھ جوڑ

یہاں اس بات کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ مغرب کے اس مقبول عام ارتقائی تصور علم سے متاثر ہوکر ہمارے ہاں بھی انبیاء کرام کے حوالے سے ایک ارتقائی تعبیر اختیار کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ جوں جوں انسانیت آگے بڑھتی جارہی تھی اس کے مسائل بھی اسی لحاظ سے تبدیل ہورہے تھے، اور اللہ تعالی نے انسانوں کی ان ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف رسل کو مختلف شریعتیں دیں۔ دوسرے لفظوں میں شریعتوں کا اختلاف انسانی حالات میں ارتقائی تبدیلی آنے کا مرہون منت تھا۔ چونکہ تبدیلی شرائع کی اس فرضی تعبیر کا مسئلہ یہ تھا کہ اس میں ختم نبوت کسی طرح فٹ نہیں ہوتی کیونکہ انسانیت کا یہ سفر تو تا قیامت چلتا رہے گا، تو اسے مکمل کرنے کیلئے ایک اضافی مفروضہ یہ گھڑ لیا گیا کہ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت انسان بحیثیت مجموعی اپنے عہد طفولیت سے نکل کر عہد شباب میں داخل ہو چکا تھا اور گویا اب وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ اسے ایک آخری اور اصولی پیغام دیکر ہمیشہ کی نبوت کے سہارے سے آزاد کردیا جائے کیونکہ باقی کا سفر وہ اپنی عقل کی روشنی میں طے کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ تعبیر ایک فرضی کہانی ہے جس کے حق میں آج تک نصوص شریعہ سے کوئی قطعی دلیل پیش نہیں کی گئی محض قیاس آرائی ہی کو حتمی بات سمجھ کر پیش کردیا گیا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت کے لئے جن مثالوں کا سہارا لیا جاتا ہے انکا تصور ارتقاء کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ مثلاً تبدیلی احکامات کی ایک مثال یہ دی جاتی ہے شریعت محمدی ﷺ میں دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا حرام قرار دیا گیا جبکہ اس سے پہلے یہ جائز تھا۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس تبدیلی کا انسانی تمدن وحالات کے ارتقاء سے کیا تعلق ہے؟ اسی طرح امت محمدی ﷺ کے لئے بہت سے ایسے جانوروں کا کھانا حلال قرار دیا گیا ہے جو پہلے کی امتوں پر حرام تھے۔ لیکن اس تبدیلی کا بھی ارتقاء کے ساتھ کیا لینا دینا؟ کیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے نظام ہاضمہ میں کوئی تبدیلی آگئی تھی کہ پہلے کا انسان انہیں ہضم کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اور جدید انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، یا یہ کہ پہلے یہ جانور ناپید تھے اور اللہ تعالی نے ان کی نسل کشی ہو جانے کے خوف سے ان کے کھانے کو حرام قرار دیا تھا؟ آخر حالات کے ارتقاء کا ان کی حرمت سے کیا تعلق؟ دوسری بات یہ کہ اگر اس کہانی کو مان بھی لیا جائے تو بھی یہ دعوی قابل نزاع ہے کہ انسانیت کا عہد شباب آج سے چودہ سو سال پہلے آ گیا تھا کیونکہ مغربی مفکرین کا دعویٰ یہ ہے کہ نیا انسان تو پیدا ہی سترہویں اور اٹھارویں صدی میں ہوا جبکہ اس سے پہلے کا انسان محض افسانوں اور کہانیوں پر یقین رکھتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ تبدیلی کا یہ عنصر تو بدستور جاری وساری ہے، مثلاً صنعتی انقلاب کے بعد کے انسان کے معاشرتی ومعاشی مسائل پہلے سے بہت مختلف ہیں تو ارتقاء کی اس تعبیر کا تقاضا یہ ہوا کہ شریعت کے بہت سے احکامات اب منسوخ قرار دیئے جائیں اور کچھ نئے احکامات کا اضافہ

کر لیا جائے۔ یہ اسی ارتقائی تعبیر کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مسلم جدیدیت پسند مفکرین اجتہاد کے نام پر نصوص شریعہ کی تبدیلی کے امکانات کی بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز اس دعوے سے تو جدیدیت پسند مفکرین کے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اسلام کی جو معتبر تعبیر اجماع امت کے نام پر پیش کی جاتی ہے وہ اب قابل عمل نہیں رہی کیونکہ وہ پرانے زمانے کے حالات کا لحاظ کر کے اپنائی گئی تھی اور اب ہمیں ایک جدید تعبیر کرنی چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ پس جاننا چاہئے کہ تبدیلی شرائع کی یہ ارتقائی تعبیر درحقیقت ایک خطرناک تصور ہے جس سے شریعت اسلامیہ میں قطع برید کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

۲.۴: سرمایہ دارانہ علم کی منطقی منزل

ایک نئی شخصیت کا جواز:

سرمایہ دارانہ جاہلی تصور علم نے اخلاق رزیلہ سے متصف ایک نئی قسم کی شخصیت کے اظہار کا جواز فراہم کیا جس کے نتیجے میں ایک نئی انفرادیت معاشروں میں مقبول ہوئی۔ سرمایہ دارانہ تصور علم سے پہلے صرف ایسی شخصیت ہی معاشروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی جن کی زندگی انبیاء کرام کی تعلیمات اور اسوئے حسنہ کا منہ بولتا ثبوت ہوتی۔ لیکن اس تصور علم نے ایک ایسی شخصیت کے علمی جواز کی بنیادیں فراہم کیں جو انبیاء کرام کی تعلیمات سے کوسوں دور اور اخلاق رزیلہ سے متصف ہونے کے باوجود بھی معاشرے میں ایک باعزت علمی مقام پر فائز ہو سکتی تھی۔ اس ضمن آئن سٹائن کی مثال نہایت واضح ہے جسے سائنس کی دنیا میں ایک امام کی سی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کی زندگی زنا و بدکاری کی غلاظت سے لت پت تھی۔ ایسے ہی باوجود اسکے کہ کانٹ اغلام باز تھا اسے مغربی فلسفے میں بلند ترین مقام حاصل ہے۔ اگر آپ مغربی علم کے کسی دلدادہ شخص کو یہ مثال دیں تو وہ کہے گا کہ اسکے اخلاق کو مت دیکھو بلکہ اہم چیز اسکا سائنسی کارنامہ ہے۔ گویا مذہبی اخلاقیات اب علم کے معنوں میں شامل ہی نہیں رہیں۔ سرمایہ دارانہ تصور علم میں ایسی معلومات کو علم سمجھا جاتا ہے جو سرمایہ دارانہ اخلاقیات یعنی حرص و حسد کی غمازی کرتی ہوں۔ آج علم کا تصور اس حد تک گر چکا ہے کہ اگر ایک ڈاکٹر، وکیل، ایم بی اے وغیرہ خاتون ننگے سر اور نیم برہنہ حالت میں ٹی وی پر بیٹھ کر انٹرویو دے رہی ہو تو اس کے علمی کارناموں کا تعارف اس شان سے کرایا جاتا ہے گویا وہ کتنی بڑی عالمہ ہے۔ اسکے مقابلے میں گاؤں میں رہنے والی خاتون جس کی حیا اسے نامحرم کے سامنے جانے سے روکتی ہو اسے جاہل، ان پڑھ اور گنوار کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ تصور علم نے مادہ پرستانہ سوچ اور دنیا داری کے رجحانات کو تقویت بخشی اور رہی سہی عیسائی اخلاقیات کا جنازہ مارٹن لوتھر اور کیلوین جیسے مفکرین کے خیالات سے برآمد ہونے والے پروٹسٹنٹ ازم نے نکال دیا۔ اس فرقے نے عیسائی عوام میں یہ خیالات عام کئے کہ دنیا کی کامیابی آخرت کی کامیابی کا پیش خیمہ ہے، اصل عبادت چرچ جانا یا ذکر واذکار کرنا نہیں بلکہ دنیا کے کام زیادہ انہماک سے کرنا ہے نیز فطرت کا مطالعہ بھی اتنا ہی اہم ہے کہ جتنا بائبل کا۔ درحقیقت جدیدیت کی کامیابی کی

اصل وجہ مادہ پرست فلسفیوں کے افکار سے زیادہ وہ مذہبی عناصر تھے جنہوں نے اصلاح مذہب کے نام پر مذہبی تعلیمات کو مسخ کر کے جدیدیت کی مذہبی توجیہات بیان کیں۔ یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس جدیدیت کی کامیابی کو اصلاح مذہب کی تحریک [Reformation] کا نتیجہ قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر اصلاح مذہب کی تحریک کامیاب نہ ہوتی تو جدیدیت یورپ میں شکست کھا جاتی۔

مذہبی مابعد الطبعیاتی حقائق کا انکار:

ادراک حقیقت کے اس ارتقائی تصور کا دوسرا منطقی نتیجہ بالاخر پس جدیدیت [post-modernism] کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے حق کے وجود ہی کا انکار کر ڈالا۔ جدیدیت نے ادراک حقیقت کے لئے سائنسی طریقے پر اعتماد کرنے کی دعوت تو دی لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ حقیقت کا حتمی ادراک ممکن ہی نہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی حتمی حقیقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تو اسے تلاش کیوں کیا جائے؟ نیز جب حقیقت معلوم ہی نہیں تو یہ کیسے طے ہوگا کہ جس سائنسی طریقے پر ہم عمل پیرا ہیں وہ ہمیں حقیقت کے قریب کر رہا ہے یا دور؟ یعنی جب منزل کا ملنا ہی ناممکن ٹھرا تو اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ 'کس طرح' دوڑا جائے؟ یہی وہ سوالات ہیں کہ جن کا جدیدی مفکرین کے پاس کوئی جواب تھا، نہ ہے اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ اس فکر نے کسی حتمی حقیقت [absolute truth] کے وجود ہی کا انکار ڈالا، یعنی حقیقت ایک اضافی [relative] شے بن گئی جو ہر فرد، معاشرے اور زمانے کے لئے مختلف ہوسکتی ہے۔ ان مفکرین کے نزدیک زندگی بعد الموت وغیرہ کے سوالات کالعدم اور لایعنی ٹھہرے یعنی جب مرنے کے بعد زندگی ہے ہی نہیں تو اسکے بارے میں سوچنا بے کار کی بات ہے۔ انکے نزدیک اصل مسئلہ تو اس وجود انسانی کا ہے جو اس دنیا میں اسے حاصل ہے، اس وجود سے پہلے انسان نہ تو کہیں تھا اور نہ ہی اس کے بعد وہ کہیں اور جانے والا ہے۔ اس حقیقت کے نتیجے میں پس جدیدیت کے نزدیک دنیاوی زندگی کی حقیقت اور معنویت محض کھیل تماشہ اور مزے کرنا ہے، وٹگنسٹائن کی فکر کا نچوڑ یہ ہے Life is a game, and maturity is to play it seriously یعنی زندگی ایک کھیل ہے اور عقلمندی یہ ہے کہ اسے سنجیدگی سے کھیلا جائے۔ بیسویں صدی کے وسط میں جب یہ فکر یورپ میں عام ہوئی تو نوجوانوں میں خودکشیاں کرنے، سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں جا بسنے اور ہیروئن اور بھنگ استعمال کر کے مست رہنے کے رجحانات پروان چڑھے۔ وٹگنسٹائن جیسے بڑے فلسفی نے بالآخر تنگ آ کر خودکشی کی۔ یہ نت نئے فیشن کی بھرمار اور راک موسیقی کا پھیلاؤ اسی زمانے کی پیداوار ہے، الغرض ہر ایسا کام کیا جانے لگا جسے لوگ عجیب سمجھتے تھے اور ہر ایسے کام میں معنی تلاش کئے گئے جنہیں لوگ عام طور پر بے معنی گردانتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر زندگی بے معنی ہے تو پھر کسی خاص طریقے سے ہی زندگی گزارنے میں معنی کیوں تلاش کئے جائیں، ہر طریقہ مساوی طور پر بے معنی ہے لہذا سب کی بے معنویت کا اظہار کرنا چاہئے۔ آخر کسی خاص طریقے کے ساتھ ہی گانا کیوں گایا جائے،

ہراس طریقے سے گانا گاؤ جسے لوگ عام طور پر غیر عقلی [senseless] سمجھتے ہیں۔ یہ اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ آئے دن سر اور داڑھی کے بالوں کے نئے نئے انداز نظر آتے ہیں، کبھی پینٹ کے پائنچے پھاڑ لئے جاتے ہیں کبھی انہیں الٹا کر کے پہنا جاتا ہے، کبھی مرد کانوں میں بالیاں لٹکائے گھومتے دکھائی دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی یہ کر رہے ہو تو جواب ملتا ہے 'فیشن'۔

ادراک حقیقت کا واحد معتبر ذریعہ وحی الٰہی

پس جدیدیت: جدیدیت کے دعووں کا انکار ہے

زندگی بعد الموت اور اسکی اصل حقیقت کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان مفکرین کے ہاتھ زندگی بعد الموت کے خلاف کوئی ایسی قاطع دلیل آگئی ہے جسے رد کرنا ناممکن ہو، بلکہ یہ حقائق حصول علم کے ان ممکنہ ذرائع کی گرفت سے ہی باہر ہیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں [یعنی حواس خمسہ اور عقل انسانی]۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ادراک حقیقت کا ذریعہ اگر کوئی ہے تو وہ وحی یعنی انبیاء کرام کی تعلیمات ہیں جنکی حیثیت خبر صادق کی ہے اور جنہیں کسی اور ذریعہ علم سے پرکھا [judge] نہیں جا سکتا ہے کیونکہ یہی اصل میزان ہیں۔ پس جدیدیت نے تو سائنس کی بالادستی کے تمام دعوے بھی رد کر دیئے ہیں، اس کے نزدیک موجودہ سائنسی علمیت مغرب میں رونما ہونے والی چند مخصوص معاشرتی و تہذیبی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو مغرب میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں پیش آئیں جن کے نتیجے میں لوگوں کے تصورات حق و باطل، خیر و شر، کامیابی اور ناکامی، عدل و ظلم، علم و جہالت سب میں یکسر تبدیلی آئی اور انسانیت کے جہاز کا سفر اخروی نجات سے ہٹا کر دنیاوی عیش و عشرت، تسخیر و اصلاح قلب کے بجائے تسخیر کائنات کی منزل کی طرف موڑ دیا گیا۔ مغربی سائنس درحقیقت مقاصد کی انھیں تبدیلیوں کے باعث پیدا ہونے والا ایک نیا طریقہ علم تھا جو ان نئے قسم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا۔

مغرب تہذیب آفاقی نہیں مقامی ہے

بڑے بڑے مغربی فلاسفہ کا اعتراف شکست

پس جدیدیت فلسفے کے ان افکار کو ان معنوں میں علمی سطح پر برتری حاصل ہوئی ہے کہ جدیدیت کے حامی مفکرین مثلاً ہیبر ماس وغیرہ کے پاس ان کے جواب میں مغربی تہذیب کے آفاقی نیز عقلی طور پر برتر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں رہی۔ البتہ ابھی اس فکر کا اظہار سیاسی سطح پر نہیں ہوا، لیکن یاد رہے کہ فکر پہلے کتابوں میں لکھی جاتی ہے اور پھر وہ معاشرے اور ریاست میں نفوذ کرتی ہے۔ آخر لوگ ایک دن میں ہی تو enlightened نہیں ہوئے تھے بلکہ کئی صدیوں کی خونی تاریخ کے بعد ہی جدیدیت معاشروں پر غالب آئی۔ بدقسمتی سے ہمارے مسلم مفکرین [جو کئی صدیاں پیچھے کی سوچتے ہیں] جدیدیت کیلئے اسلامی علمیت سے دلائل فراہم کرنے کی فکر میں کوشاں ہیں: کبھی اجتہاد کے نام پر نصوص شریعت میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، کبھی اسلام کی نئی تعبیر کی بات

کرتے ہیں، کبھی اجماعی مسائل امت سے انحراف کی دعوت دیتے ہیں، کبھی مغربی افکار وتصورات کی حقیقت سمجھے بغیر ہی انہیں اسلام میں تلاش اور انکا اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لئے مولوی کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہیں تاکہ عوام کا رابطہ علما سے کٹ جائے اور جدیدیت کی راہ ہموار ہو سکے۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مساجد و مدارس اور علمائے کرام کے وقار کا تحفظ درحقیقت جدیدیت کے خلاف جنگ میں اسلام کی زندگی اور بقا کا مسئلہ ہے، اگر ہم اس محاذ پر ہار گئے تو پھر جدیدیت کے سیلاب کے آگے بندھ باندھنے والا اور کوئی گروہ باقی نہیں رہے گا۔

۲.۵: سرمایہ دارانہ علم کی تشکیل

سرمایہ دارانہ علم درحقیقت [anthopocentric approach] یعنی 'حوادثات عالم اور انسانی زندگی اور معاشروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی تشریح وتعبیر میں انسانی نقطہ نگاہ سے غور کرنے' کے رویے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں وحی سے حاصل ہونے والے علم کی روشنی میں اس کائنات اور انسانی معاشروں کو سمجھنے کی کوشش کرنا سرمایہ دارانہ تصور علم میں معتبر علم نہیں کہلاتا۔ سائنسی علوم کے ماہرین جب بھی انسانی رویوں کے اخلاقی وغیر اخلاقی اظہار اور معاشروں وریاست کی صحیح اور غلط تشکیل وترتیب کے اصول وضع کرتے ہیں تو اس کے لئے وہ ہرگز وحی کی طرف رجوع نہیں کرتے، بلکہ وہ آزادی، مساوات اور ترقی کے مجموعی خاکے کو سامنے رکھ کر ان سوالات پر غور کرتے ہیں۔ تنویری علم سائنس کی دوشاخوں کے ذریعہ متشکل ہوا طبعی سائنس اور معاشرتی سائنس۔

تنویری علم سائنس کی دوشاخوں کی صورت میں متشکل ہوکر آج ہمارے سامنے موجود ہے: [۱] طبعی سائنس اور [۲] معاشرتی سائنس [natural and social sciences]۔ پہلے کا دائرہ کار انسانی ارادے کے کائناتی قوتوں پر تسلط کے امکانات کو بڑھانا جبکہ دوسرے کا مطلوب ایک ایسے معیاری معاشرے اور ریاست کی ترتیب وتنظیم کرنے کا لائحہ عمل وضع کرنا ہے جہاں افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور سرمائے کی بڑھوتری کے مواقع میسر آسکیں۔ اس بات کی مثال یوں سمجھی جاسکتی ہے جیسے اسلامی علمیت علم الفقہ، کلام اور تصوف وغیرہ کی صورت میں متشکل ہوکر سامنے آئی ہے۔ یعنی جیسے علم اصول فقہ اور فقہ کا مقصد قرآن وسنت میں وارد شدہ نصوص سے وہ اصول اخذ کرنا ہے جن کی روشنی میں یہ طے کیا جاسکے کہ ان گنت انسانی اعمال وافعال سے رضائے الٰہی کے حصول کا درست طریقہ کیا ہے [یعنی ان اعمال کا شرعی حکم بیان کیا جاسکے] نیز یہ معلوم کیا جاسکے کہ افراد کے تعلقات کو کن ضروری بندشوں کا پابند بنا کر معاشرے کو احکامات الٰہی کے تابع کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح سوشل سائنسز کا مقصد ایک طرف سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرے وریاست کی علمی توجیہہ پیش کرنا ہے اور دوسری طرف یہ افراد کے تعلقات میں آزادی کی ان لازمی حدود کا تعین کرنے کے اصول وضع کرتی ہیں جن کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ معاشرتی وریاستی صف بندی وجود میں آسکے [سوشل سائنسز کا معاشرتی پالیسیاں وضع کرنے کے

ساتھ کیا تعلق ہے اس کے لئے جمہوریت پر ہمارا مضمون دیکھئے: ساحل نومبر ۲۰۰۶]۔ تنویری مفکرین کا یقین تھا کہ جس طرح فطرت میں ایسے قوانین ہیں جو اشیاء پر عائد ہوتے ہیں بالکل اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ایسے قوانین فطرت ہیں جن کے تحت معاشرے قائم رہتے ہیں لہذا معاشروں اور انسانی تعلقات کی تفہیم کے لئے بھی سائنسی تجربے اور مشاہدے کا طریقہ استعمال کرنا ضروری ہے۔ سوشل سائنسز کا مقصد ایک ایسے نئے دستور، ایک ایسے نئے قانون، ایک ایسے نئے معاشرتی نظام کا قیام ہے جسے الہامی اور آسمانی قانون سے کوئی واسطہ یا رابطہ نہ ہو۔ ایک ایسا نیا سیاسی ڈھانچہ جس میں کوئی رعایا [subjects] نہ ہو بلکہ سب شہری [citizens] ہوں۔

نتائج: یاد رکھنے کی اہم باتیں

اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ علم سے مراد وہ مجموعہ معلومات ہے:

[۱] جو ارادہ انسانی وخواہشات کی تکمیل [self-determination] کو ممکن بناتا ہو، اسے سائنس کہتے ہیں، [۲] جو وحی کے علم ہونے کے انکار پر مبنی ہے لہذا یہ جہالت خالصہ ہے، [۳] جس کا مقصد انسان کے تمتع اور تصرف فی الارض اور میں لامحدود اضافہ ہے، [۴] جو اس مادہ مرستانہ تصور حیات کو بطور مقصد حیات قبول کرنے کی ذہنیت عام کرتا ہے، [۵] اس کے پھیلاؤ کے نتیجے میں افراد میں بہت سے اخلاق رزیلہ پھیلتے ہیں:

[۶] خودغرضی [اپنے مقصد کیلئے دوسروں سے تعلقات قائم کرنا]، [۷] حرص [زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی خواہش]، [۸] حسد [دوسروں سے زیادہ دولت کی خواہش]، [۹] طول امل [دنیا کی بے پناہ محبت، طویل العمری کی خواہش اور موت سے کراہیت]، [۱۰] غضب [ہر شے کو قابو اور زیر کرنے کی خواہش]، [۱۱] لذت پرستی [خواہشات نفسانی کی کثرت و بندگی]، [۱۲] عبادات کو حقیر جاننا، ضیاع اوقات، گناہ کے کاموں کو تفریح سمجھنا، کلام لغو [جو فحش گوئی، کھیل تماشوں، فلموں، ٹھٹھے بازی اور جنس مخالف کے موضوعات سے پر ہوتا ہے] وغیرہ کے اوصاف کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے، [۱۳] جس میں کوئی حتمی حق نہیں ہوتا [سوائے اس کے کہ انسان قائم بالذات ہے]

یہ فکر اور تصور بداہتاً لغو اور عقلاً باطل ہے اسی لئے فکری سطح پر سرمایہ دارانہ علمیت ایک دم توڑتی ہوئی فکر ہے، لہذا ہمیں چاہئے کہ ہم اس کی ماہیت و مقاصد کی سمجھ بوجھ حاصل کر کے اس کا محاکمہ کرنے کی کوشش کریں نہ یہ کہ اس کی حمایت میں امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماع کا انکار کر کے اس جاہلی علمیت کے لئے دلائل فراہم کر دیں۔ ہمارے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے جدیدی علمیت کے افکار ونظریات کے خدوخال پر اپنے معاشروں اور ریاست کو تشکیل دیا تو وہ لازماً ایک قوم پرست مسلم سرمایہ دارانہ ریاست ہی بنا پائیں گے جس کے نتیجے میں اس ملک کے مسلمانوں کو تو شاید کوئی فائدہ مل جائے لیکن اسلام کو ہرگز بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

اللہ تعالی سے یہی دعا کہ: اللهم ارنا حقيقة الا شياء كما هى وما علينا الى البلاغ المبين